امام ابو الحسن الاشعریؒ کا دینی فلسفہ

عبدالستار انصاری اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تاریخ اسلام، جامعہ سندھ، جامشورو

امام ابوالحسن علی بن اسماعیل اشعریؒ سن ۲۶۰ھ[1] میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ یمن کے ایک قبیلہ اشعر سے متعلق ہونے کی وجہ سے اشعری کہلائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب و بزرگ صحابی سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کی اولاد میں سے تھے۔ نویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوموسیٰؓ سے ملتا ہے۔ چونکہ بچپن میں ہی والد صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد، ان کی والدہ نے شیخ ابوعلی جبائی سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے ابوالحسن نے ان کی آغوش میں تربیت پائی اور ان ہی سے تعلیم حاصل کی اور معتزلہ کی منطق، فلسفہ اور طرز استدلال میں کامل مہارت حاصل کی۔ اس طرح بہت جلد آپ شیخ الجبائی کے معتمد اور دستِ راست بن گئے۔ ابوعلی جبائی اچھے مدرس اور مصنف تھے مگر بحث و مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے۔ ابوالحسن چونکہ شروع ہی سے نہایت حاضر جواب اور بحث مباحثہ کے ماہر تھے۔ اس لیے ابوعلی کی طرف سے آپ ہی بحث و مناظرہ میں حصہ لیتے تھے اور بہت جلد ہی آپ اس مقام پر پہنچ گئے کہ معتزلہ کے مقتدا ماننے گئے اور یہ امر یقینی نظر آنے لگا کہ شیخ جبائی

---

[1] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۲۶۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۲۴۲ تبیین کذب المفتری ص ۱۳۶ اردو، دائرۃ المعارف اسلامیہ ج ۲ ص ۷۹۸ اسلامی مذاہب ص ۲۸۲ بعض حضرات نے ان کی ولادت کا سن ۲۷۰ھ لکھا ہے (تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول ص ۱۳۱)۔

کے بعد آپ ہی ان کے جانشین ہوں گے

مگر پھر ایک انقلاب آیا اور امام موصوف نے اعتزال سے توبہ کر لی اور باقی زندگی اعتزال کی کی تردید میں گزاری۔ اعتزال سے رجوع کے بعد بغداد جاکر شیخ زکریا ساجی وغیرہ سے علم حاصل کیا علم حدیث و فقہ کی تکمیل کے بعد انتہائی جرأت و قوت سے معتزلی فکر پر حملہ آور ہوئے آپ نے ایک نئے مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جو انتہائی محدثین کے نظریات اور معتزلہ کی عقلیت پسندی پر مشتمل تھا اور پھر آپ ہی کے نام کی نسبت سے اس مکتب فکر کو اشعریہ یا اشاعرہ کہا جانے لگا۔

امام موصوف ایک زبردست عالم اور مصنف تھے۔ عقلیات و علم کلام میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے اور کبار آئمہ متکلمین میں سے تھے۔ ہزاروں تلامذہ نے آپ سے علم حاصل کیا اور کسب فیض کیا۔ بعد میں انھوں نے علمی دنیا میں بہت ہی شہرت پائی۔ خصوصاً قاضی ابوبکر باقلانی اور ابو اسحٰق اسفرائنی وغیرہ نے علم الکلام سے دنیا پر کافی اثر و رسوخ ڈالا آپ صرف علم و عقل کے ہی امام نہ تھے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عابد و زاہد بھی تھے بقول ابوالحسین السهروی، آپ نے برسوں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی[۱] نہایت منکسر المزاج اور حلیم الطبع انسان تھے انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ایک چھوٹی جائیداد جس کی روزانہ آمدنی صرف ۱۷ درہم تھی پر گزر بسر تھا[۲] امام صاحب نے زندگی کے آخری دنوں میں بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں سن ۳۲۴ھ میں وفات پائی[۳] اور کے محلہ مشرع الزوایا میں ان کو سپرد خاک کیا گیا[۴] ان کے جنازے پر یہ اعلان کیا گیا کہ یہ "ناصر دین" کا جنازہ ہے[۵]

مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں تھیں یونانی فلسفہ کی کتابوں کے تراجم کا کام دوسری صدی ہجری میں عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کے عہد سے شروع ہو چکا تھا جس سے مسلمانوں میں عقلیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا، اور ان میں اسلامی

۱ے طبقات الشافعیہ الکبری ج ۲ ص ۲۴۸ تبیین کذب المفتری ص ۱۴۱۔

۲ے طبقات الشافعی ج ۲ ص ۲۴۸ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۳۴۷ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۲۶۔

۳ے تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۳۴۷ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۲۶ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ ج ۲ ص ۷۹۸

۴ے تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول ص ۱۳۳ ۔ ۵ے تبیین کذب المفتری ص ۱۴۷

اور مذہبی اعتقادات میں فرق (ضعف) آنے لگا تھا۔ محدثین و فقہا علوم عقلیہ سے ناواقف تھے۔ اس لیے نظامِ دین کو متقضائے زمانہ کے مطابق معقول انداز سے نہیں سمجھا سکتے تھے اس لیے زجر و توبیخ سے اعتقادی گمراہیوں کو دبانے کی کوشش کرتے تھے اور علوم عقلیہ میں جن لوگوں کو کمال کا شہرہ حاصل تھا وہ علوم دینیہ میں کوئی بصیرت نہ رکھتے تھے۔ وہ صرف فلاسفہ یونان کے غلامِ محض تھے بہرحال عقلیات اور فلسفہ کی وجہ سے دین کی عقلی توجیہ و تعبیر کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو چکا تھا ایسے حالات کا عام مسلمانوں پر یہ اثر ہوا کہ وہ دین کو ایک غیر معقول چیز سمجھنے لگے اور اس کی ہر چیز انھیں مشکوک نظر آنے لگی۔ خصوصاً تیسری صدی میں معتزلہ کو جو عروج حاصل تھا۔ انھوں نے اپنے مسلک میں متشددانہ رویہ سے اس وقت دینِ اسلام کو بہت نقصان پہنچایا۔ محدثین و فقہا ان کے تشدد اور مظالم کا نشانہ بنے رہے[1] عام مسلمان صرف فیشن اور معتزلہ کے مظالم سے بچنے کے لیے اعتزال کو اختیار کر رہے تھے۔

یہ تھے وہ حالات کہ جن میں امام ابوالحسن اشعری کا ظہور ہوا۔ اور مشیت ایزدی سے وہ مذہب اعتزال سے توبہ کر کے، صحابہ کرام رضؓ اور سلف کے مسلک کو اختیار کیا[2]۔ چالیس سال تک معتزلی عقائد کی حمایت و نصرت کے بعد ان کی طبیعت میں ۳۰۲ھ میں انقلاب پیدا ہوا ابو علی جبائی سے ایک سوال[3] کا جواب اور عقلی حل نہ پاکر ان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ پندرہ دن تک گھر میں بند ہو کر سوچتے رہے اور فریقین (محدثین و فقہا اور معتزلہ) کے دلائل کا موازنہ کرتے رہے اور آخر کار

---

[1] اسلامی مذاہب شیخ ابو زہرہ ص ۲۷۱۔ [2] اس سلسلے میں مختلف روایات ہیں مشہور روایت یہ ہے کہ آپ کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ زیارت سے مشرف کیا اور آپ کو سنت کی پیروی کے ساتھ علم الکلام کے ذریعے ملاحدہ کے ابطال کرنے کا حکم دیا (تبیین کذب المفتری ص ۳۹۔ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۴۶)۔

[3] وہ سوال یہ تھا کہ تین بھائیوں میں سے ایک صغیر سنی میں فوت ہوا۔ اور دو بڑے ہو کر ایک ایمان کی اور دوسرا کفر کی حالت میں مرا تو اس صغیر بچہ کا کیا انجام ہوگا شیخ جبائی نے جواب دیا کہ اس کو ایسے مقام پر رکھا جائے گا جہاں نہ سعادت کا گزر ہوگا اور نہ عذاب کا۔ چونکہ وہ صغیر سنی میں مرا تو وہ اس رعایت کا مستحق ٹھہرا۔ اس پر امام صاحب نے پوچھا کہ ایسی رعایت کا مستحق اس شخص کو کیوں نہیں ٹھہرایا۔ جو حالت کفر میں مرا، اگر وہ بھی صغیر سنی میں مر جاتا تو عذاب سے بچ جاتا۔ شیخ جبائی سے اس سوال کا جواب بن نہ پایا۔ چنانچہ امام صاحب ان سے علیحدہ ہو گئے۔

اس نتیجہ پر پہنچے کہ اثبات عقائد کے لیے کتاب وسنت کی نصوص زیادہ بھروسہ کے لائق ہیں اور ان کے مقابلے میں عقل وخرد کی اہمیت کو ماننے کے باوجود اس کی کمزوری واضح ہے چنانچہ ایک فیصلہ کرکے وہ گھر سے سیدھے بصرہ کی جامع مسجد پہنچے۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور بے شمار لوگ مسجد میں موجود تھے۔ آپ نے بلند آواز سے معتزلی مذہب سے برأت وتوبہ کا اعلان کرتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل بیان فرمایا کہ اب وہ معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں سے پردہ اٹھائیں گے[۲]

اس دن کے بعد آپ تادم زیست اپنے علمی تجربہ، استدلال فصاحت وبلاغت اور قوت تحریر سے معتزلہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ معتزلہ، جہمیہ، جبریہ اور دوسرے باطل فرقوں اور فلاسفہ کے رد میں کافی کتابیں لکھیں[۳] جن میں نہ صرف باطل فرقوں کی تردید کی بلکہ مسلک اہل سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا جس سے لوگوں کو معتزلہ اور عقلیت پسندوں کی گمراہی کا پتہ چلا اور مسلکِ سلف واہلِ سنت کی حقانیت کا یقین ہوا۔

امام ابوالحسن اشعریؒ نے اس سلسلے میں اپنے مسلک کی بنیاد معتزلہ اور محدثین کے درمیان اعتدال وتوسط پر رکھی۔ وہ نہ تو محدثین وحنابلہ کی طرح عقائد اسلامی کے اثبات کے لیے کلی طور پر عقل کا انکار کرنا صحیح سمجھتے تھے اور نہ ہی معتزلہ کی طرح اس میدان میں عقل کی اجارہ داری کے

---

۱ طبقات الشافعیہ الکبری ج ۲ ص ۲۴۶/ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۲۷ تبیین کذب المفتری ص ۴۰

۲ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۲۷۔

۳ امام الاشعری کی تصانیف میں اختلاف ہے۔ تذکرہ نگاروں میں سے بعض نے ان کی کتابوں کی تعداد تین سو تک بیان کی ہے (تبیین کذب المفتری ص ۱۳۶) علامہ ابن حزمؒ نے ان کی کتابوں کی تعداد ۵۵ بتائی ہے علامہ ابن عساکرؒ ان کی تعداد ایک سو کے قریب بتلاتے ہیں لیکن تو دامام صاحب نے وفات سے پہلے اپنی کتابوں کی جو فہرست کتاب العمد میں دی ہے ان میں ۶۸ کتابوں کا ذکر ہے منجملہ ان کتابوں کے ایک تو قرآن کی تفسیر ہے جو بقول علامہ ذہبیؒ ۳۰ اجزاء پر مشتمل ہے آپ کی دوسری مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں۔ الابانہ عن اصول الدیانہ، کتاب اللمع، الموجز، کتاب الاستحسان الخوض فی الکلام، کتاب العمد، کتاب القیاس، کتاب الاجتہاد، کتاب الفصول، ایضاح البرہان، التبیین عن اصول الدین اور مقالات الاسلامیین وغیرہ مؤخر الذکر کتاب کا اردو ترجمہ حضرت مولانا محمد حنیف ندوی مدظلہ نے کیا ہے جو "مسلمانوں کے عقائد وافکار" کے نام سے ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

قائل تھے انھوں نے الٰہیات اور مابعد الطبیعاتی مسائل میں درمیانی راہ اختیار کی چونکہ فقہاء و محدثین صرف نقل سے کام لیتے تھے اور معتزلہ تعلیمات مذہب کو معیارِ عقل پر پرکھتے تھے مگر آپ نے مذہبی تعلیمات کی صداقت و اہمیت پر استدلال سے کام لیا۔ اور معتزلہ و فلسفہ کے دلدادہ علماء سے ان کی ہی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کی۔ اس لیے کہ آپ کے نزدیک اگر دین میں دلائل سے کام نہ لیا گیا تو لوگ معتزلہ بن جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے کتاب "استحسان الخوض فی الکلام" اسی موضوع پر تحریر فرمائی۔ آپ پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے معتزلیوں کے خلاف استدلال سے کام لیا۔ اس کے بعد اس میدان میں امام شعرانیؒ اور پھر امام غزالیؒ نے اپنے جوہر دکھائے۔

امام ابوالحسن اشعریؒ نے معتزلہ کی تین بڑے بڑے مسائل میں مخالفت اور تردید کی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مسئلہ صفات باری تعالیٰ

۲۔ مسئلہ خلق قرآن

۳۔ مسئلہ امکانِ رؤیت باری تعالیٰ

۴۔ مسئلہ اختیار

۱۔ مسئلہ صفات باری تعالیٰ

صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اشاعرہ کا نظریہ تھا کہ اللہ کی صفات مثلاً علم، بصر، کلام وغیرہ ازلی و ابدی ہیں اور ان کے ذریعے ہی وہ عالم ہے۔ بصیر ہے اور متکلم ہے اس کے برعکس معتزلہ کہتے تھے کہ خدا کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں ہیں۔ یعنی یہ کہ اس کی صرف ذات ہے صفات نہیں ہیں۔

امام صاحب کے نزدیک معتزلہ نے یہ عقیدہ اپنے برادرانِ ہم خیال فلاسفہ سے لیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس عالم کا ایک صانع تو ہے۔ لیکن نہ تو وہ عالم ہے نہ قادر ہے نہ حی ہے نہ سمیع ہے نہ بصیر ہے اور نہ صفت قدیم ہی سے اتصاف پذیر ہے۔[1]

---

[1] مسلمانوں کے عقائد و افکار (اردو ترجمہ مقالات اسلامیین) ج ۲ ص ۲۶۱۔

جہاں تک ایمان بالقرآن کا تعلق ہے تو قرآن یہ عقیدہ سکھاتا ہے کہ باری تعالیٰ کی ذات تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے " وللہ الاسماء الحسنیٰ[۱] یعنی اور (تمام) بہترین نام اللہ ہی کے ہیں (ہر نام ایک صفت ہے) اور وہ تمام نقص و حدوث سے منزہ ہے اللہ تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرًا[۲] یعنی یہ ظالم جو کچھ کہتے ہیں اللہ ان سے پاک اور بہت بلند ہے۔

امت مسلمہ کے سواد اعظم کا یہی عقیدہ ہے جو کتاب و سنت کی نصوص پر مبنی ہے۔ اشاعرہ بھی صفات کا اثبات کرتے ہیں اور " صفات لا عینہ ولا غیرہ " کے قائل ہیں سواد اعظم کے اس عقیدہ کا ذکر " عقائد نسفی " میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

" ولہ صفات قائمۃ بذاتہ وھی لا ھو ولا غیرہ[۳] یعنی خدا کی ذات صفات سے متصف ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں نہ وہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔

اسی طرح علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں :

" وھی ازلیۃ ابدیۃ زائدۃ علی الذات۔ اذ لا یعقل من مفھوم العالم الا من لہ علم وھکذا[۴] یعنی اور یہ صفات ازلی اور ابدی ہیں اور ذات پر زائد (غیر ذات) ہیں کیونکہ عالم کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ذات جسے علم حاصل ہو۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔

اشاعرہ کے نزدیک اللہ کی صفات علم ارادہ، خلق و حکمت وغیرہ اپنا الگ تشخص رکھتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات کے ساتھ جو صفات وابستہ ہیں وہ ذات ہی کے مختلف روپ نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ انفرادیت کی حامل ہے اور اس کی وابستگی وجود کی متقاضی ہے پس اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے اپنے علم کے ساتھ عالم ہے اپنی قدرت کے ساتھ قادر ہے اپنے کلام کے ساتھ متکلم ہے۔ امام اشعری کے اس عقیدہ کو علامہ شہرستانیؒ نے الملل والنحل میں یوں بیان کیا ہے۔

" وقال ابو الحسن الباری تعالیٰ عالم بعلم قادر بقدرۃ حی بحیاۃ مرید بارادۃ متکلم بکلام سمیع بسمع بصیر ببصر ولہ فی البقاء اختلاف رای قال وھذہ الصفات

---

۱ سورت الاعراف آیۃ ۱۸۰۔ ۲ سورت بنی اسرائیل آیۃ ۴۳۔

۳ شرح عقائد نسفی ص ۳۵ ۴ تہذیب الکلام تفتازانی ص ۸۲

ازلیۃ قائمۃ بذاتہ لایقال ھی ھو ولا غیرہ ولا لاھو ولا لا غیرہ[۱]

یعنی امام ابوالحسن اشعری نے کہا کہ باری تعالیٰ عالم ہیں علم کے ساتھ قادر ہے، قدرت کے ساتھ حی ہے حیات کے ساتھ، مرید ہے ارادہ کے ساتھ، متکلم ہے کلام کے ساتھ، سمیع ہے سمیع کے ساتھ، بصیر ہے بصر کے ساتھ، صفت بقا کے بارے میں ان کے رایوں میں اختلاف ہے امام اشعری کا کہنا ہے کہ یہ صفات ازلی اور ذات باری کے ساتھ قائم ہیں۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفات عین ذات ہیں نہ یہ کہ غیر ذات ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام موصوف کا مسلک اس معاملے میں معتزلہ وجہمیہ اور مشبہ ومجسمہ کے مابین ہے اس لیے کہ معتزلہ وجہمیہ جو قرآن میں وارد شدہ صفات کی نفی کرتے ہیں اور مشبہ ومجسمہ صفات باری کو صفات حوادث کے مماثل قرار دیتے ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے مگر امام صاحب قرآن وسنت میں وارد شدہ صفات کو ذاتِ باری کے لیے ثابت کرتے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ صفات صرف شان ایزدی کے لائق ہیں اور صفاتِ حوادث کے مماثل نہیں[۲] مثلاً خدا کی صفات سمع بصر اور کلام انسانوں میں پائے جانے والی سمع وبصر اور کلام کے مانند نہیں بلکہ ان کی کلی ماہیت ہی مختلف ہوتی ہے کیونکہ "لیس کمثلہ شیٔ"[۳] یعنی اس جیسا کوئی نہیں ۔ چنانچہ اشاعرہ اس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات میں سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی اور کسی اعتبار سے کسی چیز سے بھی مشابہت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ مسئلہ خلق قرآن:

دوسرا اہم مسئلہ جس میں امام الاشعری نے معتزلہ کی مخالفت کی وہ ہے مسئلہ خلق قرآن۔ اسلامی الٰہیات کا یہ ایک قدیم مسئلہ ہے جس کے بارے میں ابوالحسن الاشعری کا عقیدہ ہے کہ کلام چونکہ اللہ کی ازلی صفت ہے اس لیے قرآن مخلوق نہیں ہے اس کے برعکس معتزلیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مخلوق اور حادث ہے۔

---

۱ الملل والنحل ج ۱ ص ۱۲۹ ۲ تبیین کذب المفتری ص ۱۲۹

۳ سورت الشوریٰ آیت ۱۱

معتزلہ نے اس سلسلے میں قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا ہے "انا جعلناہ قرآناً عربیاً"[1] یعنی ہم نے قرآن کو عربی زبان میں بنایا۔ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ جو چیز بنائی جائے وہ ظاہر ہے مخلوق ہوگی اور یہ بھی کہ "بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ"[2] یعنی قرآن مجید لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے جب قرآن کا احاطہ لوح محفوظ کیے ہوئے ہے تو قرآن مخلوق ہوا اس لیے کہ احاطہ صرف اس چیز کا ہو سکتا ہے جو مخلوق ہو۔

امام الاشعریؒ نے معتزلہ کا اس بارے میں ابطال کیا ہے اور "کتاب الابانہ" میں دلائل و براہین سے کلام قرآن کا غیر مخلوق ہونا ثابت کیا ہے۔ مثلاً امام موصوف نے قرآن کی آیت "انما قولنا لشئ اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون"[3] سے یہ استدلال کیا ہے کہ

" فلو کان القرآن مخلوقا لوجب ان یکون مقولاً لہ کن فیکون ولو کان اللہ عز وجل قائلا للقول کن کان للقول قول وھذا یوجب احد امرین اما ان یؤل الامر الی ان قول اللہ غیر مخلوق او یکون کل قول واقع لقول لا الی غایۃ وذالک محال"[4]۔

یعنی اگر قرآن مخلوق ہوتا تو یہ ضروری تھا کہ اللہ کا قول "کن فیکون" ہوتا اور اگر اللہ کن کہنے والا ہوتا تو اس قول کے لیے ایک اور قول ہوتا اور اس سے دو چیزوں میں ایک چیز لازم آتی ہے یا یہ کہ آخر کار معاملہ یہاں تک پہنچے کہ اللہ کا قول غیر مخلوق ہے یا یہ کہ ہر قول ایک دوسرے قول کے ذریعے واقع ہو۔ اسی طرح یہ سلسلہ لامتناہی جاری رہے جو محال ہے جب یہ محال ہے تو ثابت ہوا کہ اس کا قول غیر مخلوق ہے۔

اسی طرح امام موصوف سورۃ الاخلاص سے یوں استدلال کرتے ہیں:

فکیف یکون القرآن مخلوقا واسم اللہ فی القرآن ھذا یوجب ان یکون اسماء اللہ مخلوقۃ ولو کانت اسماؤہ مخلوقۃ لکانت واحدانیتہ مخلوقۃ وکذالک علمہ و قدرتہ تعالی اللہ عن ذالک علوا کبیرا[5]

---

[1] سورۃ الزخرف آیت ۳ - [2] سورۃ البروج آیت ۲۱-۲۲ - [3] سورۃ النحل آیۃ ۴۰ -
[4] کتاب الابانہ صـ۲۱ [5] ایضاً ص۲۲ -

یعنی قرآن کس طرح مخلوق ہوسکتا ہے جب کہ اس میں اللہ کا نام موجود ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام مخلوق ہوں اور اگر اس کے نام مخلوق ہوں تو اس کی وحدانیت بھی مخلوق ہوگی یہی حال اس کے علم وقدرت کا ہے اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔

معتزلہ نے اس مسئلہ میں اس درجہ غلو اور مبالغہ کیا کہ اس کو توحید کی طرح ایک اہم عقیدہ بنالیا۔ اور جس نے اس معاملے میں ان سے اختلاف کیا ان کے خلاف کفر والحاد کا فتویٰ دے دیا اور عباسی خلیفہ مامون ومعتصم (جو معتزلی تھے) کے ذریعے قرآن کو مخلوق نہ ماننے والوں پر جبر وتشدد کیا گیا۔ اور انھیں قید وبند کی صعوبتیں دی گئیں۔[1]

(جاری ہے)

[1] اس سلسلے میں محدثین وفقہاء پر بہت مظالم کیے گئے اور ان کی دردناک اذیتیں دی گئیں۔ خصوصاً امام احمد بن حنبل جو محدثین کی طرف سے اس مسئلہ پر سینہ سپر تھے ان پر بے انتہا ظلم کیا گیا۔ ان کو ۲۸ مہینہ قید میں رکھا گیا ان پر کوڑے برسائے گئے یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ کے جسم مبارک پر کوڑوں کے نشانات موجود تھے مگر امام صاحب نے نہایت ثابت قدمی اور استقامت سے اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔ اور معتزلہ کے مقابلہ میں ڈٹ گئے اور ان کے پاؤں میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی۔ آپ کی اس قربانی کے نتیجہ میں آخر کار یہ فتنہ ختم ہوا۔

بقیہ: غالب نامہ

لیا اور اسی نام سے شہرت پائی وہاں جو اور کام کیے ان کی تفصیل میں تو نہیں جاتا بس اتنا یاد رکھیے کہ مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمۂ قرآن اور مولوی شبیر احمد عثمانی کا حاشیہ اول سے آخر تک فارسی میں منتقل کر دیا جو غلطی سے بعض پریس والوں نے تفسیر عثمانی کے نام سے شائع کیا ان کی زندگی کا یہ سب سے آخری کارنامہ تھا ان کا پہلا کارنامہ شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب "الفوز الکبیر" کا اردو ترجمہ تھا۔

میں تیاریاں مکمل کرنے کے بعد یہاں سے کلکتے گیا پھر رانچی پہنچا کہ مولانا ابوالکلام کو پوری تفصیل سنا دوں وہ شہر سے باہر مہاراجہ رابندرناتھ ٹیگور کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ میں تین دن مقیم رہا ان تین دنوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ تجویز پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہی فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال اس مسئلہ کو یہیں پر چھوڑ دیا جائے اس کے بعد میں لاہور میں واپس آگیا اور یہ معاملہ آئندہ پر ملتوی ہوگیا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ